تحفہ من جانب علی محمد

مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء

از

قاضی محمد عدیل عباسی ایڈووکیٹ بستی

شائع کردہ

آل انڈیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز کنونشن کونسل

(مطبوعہ یونائٹیڈ پریس لکھنؤ)

بماہ جولائی ۱۹۷۲ء

تحفہ من جانب ... (۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۷۲ء

از قاضی محمد عدیل عباسی۔ ایڈوکیٹ بستی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ۷۲ء کی تائید تقریباً عام مسلم وزراء نے کی ہے۔ خواہ وہ حکومت ہند سے تعلق رکھتے ہوں یا ریاستوں سے اور بعض اردو اخبار بھی بڑے زور شور سے اُن لوگوں کی مذمت کر رہے ہیں۔ جو اس ایکٹ کے مخالف ہیں۔ ان میں "قومی آواز" سب سے آگے ہے۔ ان کو رجعت پسند یا پاکستانی قرار دیا جا رہا ہے۔ اور یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ بھٹو اندرا گاندھی ملاقات میں روڑا اٹکانے کیلئے اس کے خلاف احتجاج کا نعرہ بلند کیا گیا ہے۔ حکومت نے سخت رویہ اختیار کیا ہے۔ اور ہر طرح فریاد کا منھ بند کر دینا چاہتی ہے۔ بعض لوگ مزاحاً یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ اقلیتی کردار کے کیا معنی ہیں؟ ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے آیئے ٹھنڈے دل سے ان امور پر غور کریں۔

(ا) اگر اقلیتی کردار بے معنی چیز ہے تو پھر وزیر اعظم نے کیوں کہا کہ "ہم اقلیتی کردار تسلیم نہیں کر سکتے۔" اس کا تو مطلب یہ ہے کہ وہ اقلیتی کردار کے مفہوم سے کما حقہ واقف تھیں۔ اور انھوں نے اس کی شرح بھی کی۔ اور کہا کہ اگر ہم مسلمانوں کو ایک یونیورسٹی دے دیں۔ تو کل اقلیتیں مطالبہ کریں گی۔ ہم کس کس کو یونیورسٹی دیں گے۔ اس کے بعد بھی یہ کہنا کہ اقلیتی کردار ہے کیا چیز۔ تجاہلِ عارفانہ اور تمسخر اڑانے اور زخم پر نمک پاشی کرنے کے سوا اور کیا ہے۔

اقلیتی کردار کی وضاحت سیکڑوں مضامین اور پمفلٹ وغیرہ میں کیجا چکی ہے۔

اور یہ ایک بدیہی بات ہے۔ یعنی یونیورسٹی کا نظم و نسق مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو۔
یونیورسٹی کے انتظام کے لئے ایک جماعت بنی تھی۔ جس کو کورٹ کہتے ہیں۔
۱۹۲۰ء میں جب یونیورسٹی وجود میں آئی۔ تو کورٹ کے کل ممبران قانوناً مسلمان
ہوتے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں جب دوسرا ایکٹ پاس ہوا تو اس میں غیر مسلموں کیلئے بھی
گنجائش رکھی گئی۔ یہ طریقۂ انتخاب ایسا تھا کہ زبردست اکثریت مسلمانوں کی رہتی
تھی۔ اور دونوں قوانین میں کورٹ سپریم گورننگ باڈی تھی۔
۱۹۶۵ء میں جب نواب علی یاور جنگ کا افسوسناک حادثہ پیش آیا۔ تو آرڈیننس
جاری ہوا اور اس کے مطابق ایکٹ بنا۔ وہ ایک عبوری دور کے لئے تھا۔
بعدہٗ جو ترمیمی بل تجویز ہوا، اس میں کورٹ کو سپریم گورننگ تحریر کیا گیا
تھا۔ یعنی صرف ایک لفظ باڈی کو اتھارٹی میں بدل دیا گیا تھا۔ بعض دانشوروں
نے مجھ سے کہا کہ آپ لوگ اس پر راضی ہو جائیں۔ کیونکہ "اتھارٹی" "باڈی" سے بہتر ہے۔
اب اچانک کورٹ کو قطعی ختم کر دیا گیا۔ اس کا سب اختیار چھین لیا گیا۔ وہ ایک لاشہ
بے جان بنا دی گئی۔ اور اسے ایڈوائزری باڈی یعنی مشورہ دینے والی
جماعت قرار دے دیا گیا۔ اور اس میں مسلمان اکثریت بھی مشتبہ ہے۔ اسی طرح بالجبر
اچانک مسلمانوں کے ہاتھوں سے مسلم یونیورسٹی چھین لی گئی۔
(۲) مسلم اقلیتی کردار کیا ہے۔ وہ تو اوپر ظاہر کیا جا چکا ہے۔ اب اس کے
نتائج کیا ہوتے تھے۔ جو سند مجھے ایم۔ اے اور لا کی اس یونیورسٹی سے ملی ہے۔ وہ
انگریزی میں ہے۔ لیکن اس کے اوپر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" اور "علم الانسان مالم یعلم"
لکھا ہوا ہے۔ یونیورسٹی کا ہر جلسہ کلام پاک سے شروع ہوتا تھا۔ اذان ہونے پر کھیل
بند ہو جاتا تھا۔ البتہ تعلیم جو اور یونیورسٹیوں میں ہوتی تھی۔ یہاں بھی ہوتی تھی۔ ہندو
مسلمان سب پڑھتے تھے۔ اور مل جل کر رہتے تھے۔ ہر یونیورسٹی ایک عظیم درسگاہ ہے

جہاں سے خیالات نظریات اور حقائق کائنات کی موجیں نکلتی ہیں۔ وہ ایک نمونہ اخلاق عالیہ اور مخصوص کلچر کا پیش کرتی ہے۔ جو برقی رو کی طرح دلوں تک پہونچتی ہے کوئی زبان سے کہے یا نہ کہے۔ جن جن جگہوں پر یونیورسٹیاں ہیں۔ ہر ایک کا مخصوص کلچر ہے۔ اگر ہندوستان میں ہر کلچر ہر زبان ہر مذہب اور ہر عقیدے کو زندہ رہنے کا حق ہے تو مسلم یونیورسٹی نے کیا قصور کیا تھا۔ کہ اسے اس حق سے محروم کردیا جائے۔ کیا یہ کوئی ڈھکی چھپی بات ہے کہ میزو اور ناگا کو حکومت نے اپنے کلچر کے مطابق رہنے سہنے اور قانون بنانے کا حق دیا ہے، البتہ نزلہ برعضو ضعیف کی بات ہو تو وہ انصاف نہیں جبر ہے۔ اور اقلیت پر جبر جمہوریت کے منافی ہے۔

(۳) اس سلسلے میں ایک بات یہ غور طلب ہے کہ اشارتاً کنایتہً یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ شروع سے سب کے دل میں یہی بات جمی ہوئی تھی کہ ۱۹۲۰ء پر لوٹ جانا تو شاید ممکن نہ ہو مگر ۱۹۵۱ء کا ایکٹ بحال رکھا جائے گا۔ اور الحاق کی دفعہ ختم کردی جائے گی۔ اگر حکومت کو ایسا انقلابی قدم اٹھانا تھا تو کیا یہ ضروری نہ تھا کہ اس کی اشاعت کی جاتی۔ اور لوگوں کو بتلایا اور سمجھایا جاتا۔ کیا حکومت مسلمانوں کے گہرے جذبات سے جو اس معاملے کے بارے میں تھے واقف نہ تھی؟ کیا مسلمانوں کا یہ حق نہ تھا کہ ان کو بتلایا جاتا کہ ایسا قانون آنیوالا ہے اور ان کو سمجھایا جاتا کہ ان کے لئے یہی مفید ہے۔ آخر دنوں میں پتہ چلا کہ بل مرتب ہوکر وزیراعظم کے پاس ہے۔ اور کسی کو اس کی خبر نہیں ہے۔ اس افواہ کی جو بھی حقیقت ہو۔ لیکن ہم لوگوں کو قطعی پتہ نہیں چل سکا۔ ہم دلّی دوڑتے اور تلاش کرتے رہے۔ کچھ عرصہ قبل جب اولڈ بوائز کنونشن کونسل کا وفد علی گڑھ گیا تھا۔ تو وائس چانسلر ڈاکٹر علیم صاحب نے فرمایا تھا۔ ۱۹۵۱ء کا ایکٹ بحال رہے گا۔ جو بل کے مجوزہ دفعات تھے۔ ان کے بارے میں فخرالدین علی احمد صاحب نے تمام ہندوستان کے

مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ اور تجاویز مانگیں اور آخر کار دلّی میں جلسہ کر کے کمیٹی بنائی۔ اس مجوزہ بل پر تو اتنی محنت جس میں اس طرح اقلیتی کردار کو رد نہیں کیا گیا تھا اور اس بل کو اس درجہ پردۂ خفا میں رکھنا اور دو دن میں پاس کر دینا۔ مجوب علی گڑھ کو ختم کر دینا اور آنسو بہانے کی اجازت نہ دینا بہت ہی تعجب خیز ہے۔

(۴) وہ لوگ جو بل کی مخالفت کر رہے ہیں اور مخالفت کیا کر رہے ہیں بلکہ مخالفت کر ہی کیا سکتے ہیں۔ صرف ایک دیوارِ گریہ تعمیر کر رہے ہیں۔ کیا وہ رجعت پسند یا پاکستانی ہیں۔ اسی طرح اُردو کے بارے میں بھی کہا جاتا تھا۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ لکھنؤ میں جو آل انڈیا اولڈ بوائز کنونشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بارے میں ہوا اور جس میں تمام ہندوستان کے اور ہر جماعت کے نمائندے شریک ہوئے۔ کیا وہ سب پاکستانی تھے۔ اس کنونشن کے بعد عبدالقیوم صاحب انصاری نے پٹنہ میں نیشنلسٹ مسلمانوں کے نام سے کنونشن کیا۔ اور اس میں لکھنؤ کنونشن سے بھی زیادہ تیز تجویز اقلیتی کردار کے بارے میں پاس کی تو کیا یہ سب پاکستانی تھے۔ جمعیتہ علماء ہند نے جب آرڈیننس کے خلاف رٹ سپریم کورٹ میں داخل کی تو کیا وہ پاکستانی ہو گئی۔ کیا جب فخرالدین علی احمد صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ اٹھایا تو کیا وہ پاکستانی تھے۔ کیا یونس سلیم صاحب وزیر ریاست ہوتے ہوئے جب وند لیکر وزیر اعظم کے پاس گئے اور اس کے اقلیتی کردار کے بحال کرنے کا مطالبہ کیا تو کیا وہ پاکستانی تھے؟ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ان کا ایک ادارہ ہو خواہ وہ سیکولر تعلیم کا ہو یا مذہبی یا دونوں کا مخلوط ہو پاکستانیت سے کیا تعلق رکھتا ہے؟ اور کیا اس طرح کی بات کہنے والے انتہا درجہ کے غیر ذمہ دار لوگ نہیں ہیں۔ رہا یہ کہ بھٹو اندرا گاندھی ملاقات میں روڑا اٹکانے کے لئے یوم احتجاج منانے کا

اعلان ہوا۔ تو وقت کا تعین بل کو دو دن کے اندر پاس کرنے والوں کی گردن پر ہے یا احتجاج منانے والوں کی گردن پر؟ کیا کسی کے گھر میں اگر موت ہو جائے اور وہ رونا شروع کرے۔ تو قریب کے گھر کے لوگوں کو جہاں شادی ہے یہ کہنے کا حق ہے کہ ابھی چُپ رہو، جب ہم خوب جشن منالیں تو رونا۔ اس قسم کی طفلانہ باتیں صرف ڈرانے دھمکانے اور خوف دلانے کے لئے کہی جاتی ہیں۔ اور وہ لوگ کہتے ہیں جن کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۵) ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ بل سے آزردہ کیوں ہیں۔ اس میں تو اس کا تاریخی کردار بحال رکھا گیا ہے جس کے معنی اقلیتی کردار ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ اگر تاریخی کردار کے معنی اقلیتی کردار کے تھے تو وزیر اعظم نے اپنی پارلیمنٹری پارٹی کی تقریر میں تاریخی کردار کی موافقت اور اقلیتی کردار کی مخالفت کیوں کی۔ اور پھر تاریخی کردار کے بارے میں وزیر اعظم نے پارلیمنٹ میں ایک لفظ نہیں کہا۔ باہر انھوں نے کیا کہا۔ اس کی قانونی قیمت بہت کم ہے۔ رہے بیچارے ڈاکٹر نور الحسن تو وہ صرف اسٹیٹ منسٹر اور کیر ریسٹ ہیں ان کا کہنا نہ کہنا کوئی بھی وزن نہیں رکھتا۔

(۶) اس وقت حالت یہ ہو گئی ہے کہ بہت سے لوگ اس کو خوشنودیٔ مزاج حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں کہ بل کی تائید کریں۔ مولانا اسحٰق سنبھلی جو دو مرتبہ کمیونسٹ ٹکٹ پر پارلیمنٹ کے ممبر رہے ہیں۔ کہہ دیا کہ اقلیتی کردار منظور کر لیا جاتا تو علی گڑھ ایک دینی ادارہ بن جاتا؟ کیا اسحٰق سنبھلی صاحب کا مطلب یہ ہے کہ علی گڑھ کا کورس دوسری یونیورسٹیوں سے مختلف ہے یا ہو جاتا۔ راحت مولائی صاحب جو ہوا کا رُخ دیکھ کر پالیسی کا رُخ بدلتے رہنے کے ماہر خصوصی ہیں۔ پہلے جا کر بل کی مخالفت کے جلسہ میں شریک ہوئے۔ اور جب کانگریس سے جواب طلب ہوا۔

تو اس کی مدح و ثنا میں قصیدے پڑھنے لگے ۔

معشوق ما بہ شیوۂ ہر کس موافق است

با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

(۷) کمیونسٹ ہمیشہ سے مسلم یونیورسٹی کے کردار کے مخالف رہے ہیں انھیں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اپنے کو کمیونسٹ کہنے کے بجائے ترقی پسند کہتے ہیں انھیں لوگوں نے وزیر اعظم کو غلط مشورہ دیدیا۔ اور ایک بڑا سوال یہ پیدا کر دیا کہ تمام اقلیتوں یعنی عیسائیوں، سکھوں اور مسلمانوں کے پھیلے ہوئے تعلیمی اداروں کا آئندہ کیا حشر ہوگا۔ اگر وزیر اعظم کی یہ دلیل مان لی جائے کہ یونیورسٹی کو گورنمنٹ رقم دیتی ہے تو ان سب اداروں کو بھی دیتی ہے۔ اور اگر یہ استدلال ہے کہ علی گڑھ میں صرف آٹھ ہزار لڑکے پڑھتے ہیں کُل ہندوستان کے کُل مسلمان لڑکے نہیں پڑھتے تو یہی حال تمام دیگر اداروں کا ہے۔

(۸) وزیر اعظم کا یہ بیان بھی قابلِ غور ہے کہ اگر گورنمنٹ مسلمانوں کو ایک یونیورسٹی دیدے تو دوسری اقلیتوں کو کیوں نہ دے۔ گزارش ہے کہ اگر دوسری اقلیتیں اس طرح پچاس سال اپنا خون پسینہ ایک کر کے کوئی یونیورسٹی بنائیں۔ تو انھیں کیوں نہ دیدی جائے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ گورنمنٹ سے ہم یہ نہیں مانگ رہے تھے کہ ہمارے لئے ایک یونیورسٹی بنا دیجئے۔ ہم نے جو محنت اور ریاضت اس تعلیم گاہ کے بنانے میں کی ہے جس طرح اپنا پسینہ گرایا ہے اور روپیہ صرف کیا ہے۔ وہ سب کو معلوم ہے۔ ہم تو صرف یہ کہتے تھے کہ ہماری چیز ہے ہم سے نہ چھینئے۔ اس کی تعلیم عام ہے۔ اس میں ہندو مسلمانوں کا کوئی فرق نہیں ہے۔ پھر کون اصول تھا جس کی بنا پر اس کو ختم کر دیا۔

(۹) وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔

اولڈ بوائز اور عامۃ المسلمین کی بڑی بڑی اُمیدیں ان سے وابستہ رہی ہیں۔ اس لئے اس بل سے ہم کو سخت دھکا لگا ہے۔ اور ہم کو یہ پریشانی پیدا ہوگئی ہے کہ آیا جمہوریت میں اقلیتوں کے مخصوص مراعات کے بارے میں لیڈرانِ قوم اور دستور کی جو پالیسی رہتی ہے۔ جس کی قیادت ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ کے نظائر سے ہوتی رہی ہے۔ ان کے بارے میں پالیسی میں کوئی ترمیم تو نہیں ہو رہی ہے۔ اس پر ہمیں اب تک کوئی یقین دہانی نہیں کرائی گئی ہے۔ باقی رہا علی گڑھ تو اس کے اقلیتی کردار سے مسلمان کبھی دست بردار نہیں ہوں گے۔ خواہ کتنا بھی زمانہ گذر جائے۔ شائع شدہ قومی آواز مورخہ ۲۴ر جون ۱۹۷۲ء

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ایڈیٹر قومی آواز لکھنؤ کے نام ایک خط

مکرمی! آپ کے مقالہ افتتاحیہ مورخہ ۲۶ر جون کے دلائل کا وزن بہت کمزور ہے آپ نے لکھا ہے کہ سنہ ۱۹۵۱ء کے ایکٹ میں غیر مسلموں کی گنجائش نکالنے کے بعد اس کے کردار میں کسی تبدیلی کا اندیشہ ظاہر نہیں کیا گیا تو "پھر اب یہ اندیشہ کیوں ظاہر کیا جا رہا ہے"؟ کیا آپ کو یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ سنہ ۱۹۵۱ء کے ایکٹ میں کورٹ اقتدارِ اعلیٰ کی مالک تھی۔ کورٹ میں پہلے کل اور بعد کو بذریعہ انتخاب غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی اس لئے اندیشہ نہیں تھا۔ آج کورٹ کو مفلوج کر دیا گیا ہے وہ ایک شورہ دینے والی جماعت رہ گئی ہے اور اس کا طریقۂ انتخاب بھی ایسا ہے جس سے اس میں مسلم اکثریت محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اور اگر اکثریت مسلمان کی ہو بھی تو کیا جبکہ اس کا کوئی اختیار ہی نہیں رکھا گیا ہے۔ اور یہیں سے

اقلیتی کردار ختم ہوا ہے۔ اگر سیاست دانوں کی طرح "بہر باطل را دلیلے محکمے" تلاش کرنے کی آرزو نہ ہو اور اگر مسلمان کو دودھ پیتا بچہ یا پیدائشی احمق تصور نہیں کیا جاتا ہے تو وہ یہ سمجھ لیگا کہ یونیورسٹی اس سے چھین لی گئی ہے۔

دوسری عجیب بات آپ نے یہ لکھی ہے کہ "جب دوسری یونیورسٹیاں پارلیمنٹ کے اختیار میں ہیں۔ تو ایک یونیورسٹی کسی ایک فرقے کے کنٹرول میں کیسے دیجا سکتی ہے۔" آپ نے جو کچھ اوپر لکھا ہے اس میں اور اس جملہ میں کھلا ہوا تضاد ہے۔ ایک طرف تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یونیورسٹی مسلمانوں کے کنٹرول میں رہے گی اس کا کردار نہیں بدلا۔ دوسری جانب آپ یہ فرماتے ہیں کہ "کسی ایک فرقہ کے کنٹرول میں کیسے دی جا سکتی ہے۔" جس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک نہیں تھی اب دینا ہے۔ اقلیتوں کو دیئے گئے تحفظات تو گویا گلدستۂ طاق نسیاں ہو گئے۔

آپ کا یہ کہنا کہ یونیورسٹی گورنمنٹ کے پیسوں سے چلتی ہے۔ اس لئے یہ نہ تو آرٹیکل ۳۰ میں آ سکتی ہے اور نہ مسلمانوں کے کنٹرول میں دی جا سکتی ہے بلا کسی قانونی دلیل کے ہے۔" مجھے تو سب سے زیادہ خطرناک یہی دلیل معلوم ہوتی ہے۔ آج جتنے امدادی ہائی اسکول انٹر کالج ہیں سب گورنمنٹ کے پیسوں سے چلتے ہیں اور سکھ، عیسائی، پارسی، شیعہ، سنّی طبقوں کے انتظام میں ہیں۔ حالت یہاں تک ہے کہ اگر فیس اور مقررہ امداد ملا کر کچھ کمی آتی ہے تو اتنا روپیہ گورنمنٹ خزانہ میں جمع کر دیتی ہے۔ پھر مسلم یونیورسٹی ہی کے ساتھ یہ امتیاز کیوں برتا گیا۔ جی نہیں۔ اس میں کوئی راز ہے اور پوری مسلم قوم ایسی عقل سے عاری نہیں کہ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ مسلم کلچرل وجود کی جڑ پر کیوں کلہاڑا مارا گیا ہے۔

آپ نے ڈاکٹر نور الحسن کے بیان کا حوالہ دیا ہے۔ ہم لوگوں کی نگاہ میں

اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ وزیر اعظم نے جو تاریخی کردار کی بات کہی ہے اس سے بھی ہمیں کوئی تسلی نہیں ہوئی۔ اصل چیز قانون ہے نہ کہ کسی عظیم سے عظیم شخصیت کا اعلان۔ لال بہادر شاستری نے بحیثیت وزیر اعظم جو تحریری وعدہ ہم سے کیا تھا اس کا حشر ہم نے اس بل میں دیکھ لیا۔ مہاتما گاندھی کے اقوال کے بھی پرخچے فضائے آسمانی میں اڑ رہے ہیں۔

آپ نے پارلیمنٹ اور وزیر اعظم پر اعتماد کی بات کہی ہے۔ شریمتی اندرا گاندھی ایک بیدار مغز، مدبر اور جہاں بانی کے ساتھ جہاں بینی کے وصف سے بھی ممتاز ہیں، انھوں نے فرمایا ہے کہ سیاست میں مستقل دوست اور مستقل دشمن نہیں ہوتے۔ تو گزارش ہے کہ اعتماد بھی مستقل نہیں ہوتا۔ اور پھر پارلیمنٹ تو جمہوری نظام میں ایک چلتی پھرتی چیز ہے۔

حکومت نے جس جلد بازی سے یہ قانون پاس کیا ہے اس کا جواز آپ نے یہ نکالا ہے کہ "اسے جلد بازی کیلئے مجبور کیا گیا"۔ تو کیا اس کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ یہ بل سوچ سمجھ کر نہیں لایا گیا بلکہ اشتعال اور ضد میں پاس کیا گیا ہے۔ یہ بات تو ہماری پارلیمنٹ کیلئے بہت ہی ناقابلِ یقین اور نازیبا ہے۔

آخر میں آپ نے قوم پرور اور رجعت پسند کی بحث چھیڑی ہے۔ اس معاملہ میں مجھے آپ سے کچھ گزارش کرنی ہے اور ذاتیات کو درمیان میں لانے کی معافی چاہتا ہوں۔ میں ۱۸ سال کی عمر سے کانگریس میں ہوں اور اس وقت میری عمر ۷۰ سال ہے۔ کیا کیا واقعات نہیں پیش آئے مگر میرے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی اور تمام عمر فرقہ واریت سے لڑتا رہا۔ میں ان لوگوں کو سچا قوم پرور یا نیشنلسٹ نہیں سمجھتا جو مسلمانوں کی اقتصادی یا تعلیمی پسماندگی کا رونا روتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مذہب اور کلچر کے معاملے کے سوا کسی فرقہ کی اور کسی بات کا غم کرنا فرقہ پروری ہے۔

ایک مسلمان کو ایک ہریجن کا اسی طرح درد کیوں نہ ہو جس طرح ایک مسلمان کا ہے۔ مالی اور تعلیمی دونوں معاملات میں اور ہر معاملے میں مذہب اور کلچر کے سوا میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق کو گناہ سمجھتا ہوں۔ آپ کے پاس قومی آواز کی فائلیں ہیں۔ انجمن اسلامیہ جب بنی ہے تو اس وقت کے میرے مضامین ملاحظہ فرمالیجیے۔ لیکن مذہب اور کلچر کے معاملے میں قوم پرور اور رجعت پسند کا فرق کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے جو مکاتب قائم کئے جاتے ہیں ان کا انتظام دینی تعلیمی کونسل کے سپرد ہے اور اس میں ہر طبقۂ خیال کے لوگ ہیں۔ میں ایک الٹرا نیشنلسٹ ہوتے ہوئے اس کا جنرل سکریٹری ہوں۔ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس کے صدر ہیں جو مسلم مجلس کے خیال کے ہیں۔ یہ ادارہ سیاسیات سے الگ ہے اور ہم لوگ سیاسیات میں ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہوئے اس ایک کام یعنی بنیادی تعلیم کے مسئلہ میں متفق ہیں۔ ۱۹۶۷ء کے الکشن میں میں نے دھواں دھار مضامین مجلس مشاورت اور مسلم مجلس کے خلاف لکھے ہیں۔ جو آپ ہی کے اخبار میں چھپے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم اس کام کو چھوڑ دو کیوں کہ اس میں مولانا ابواللیث اور ڈاکٹر فریدی بھی ہیں۔ تو یہ بات اس کی تعصب اور تنگ نظری پر مبنی ہوگی۔

یہی حال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ہے۔ اس کا معاملہ مسلم کلچر کا معاملہ ہے۔ آرٹیکل ۳۰ دستور ہند کے وجود کا معاملہ ہے۔ گورنمنٹ کے وزیر قانون یہ کہہ چکے ہیں کہ حکومت اس آرٹیکل میں ترمیم کا ارادہ رکھتی ہے۔ بے حساب چیخ و پکار کے باوجود گورنمنٹ نے ابھی اس کی تردید نہیں کی ہے۔ کوٹھاری کمیشن رپورٹ میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ پرائیویٹ مکاتب کو بند کرنے کے لئے ایسے قوانین بنانے چاہئیں کہ یہ مکاتب بھی ختم ہو جائیں۔ اور آرٹیکل ۳۰ کی خلاف ورزی بھی نہ ہو۔ ہیجان انگیز احتجاج تحریر اور تقریر اور وزیر تعلیم کی خدمت میں وفد وغیرہ جیسی کوششوں کے باوجود

ابھی ہم کو کوئی یقین دہانی نہیں کرائی گئی ہے۔

ان حالات میں مسلمانانِ ہند جاننا چاہتے ہیں اور صاف صاف کہ ۲۲ سال تک جن امیدوں کے سایے میں ہم مطمئن بیٹھے تھے کیا وہ ہٹا لئے گئے ہیں تو ہمیں بتلایا جائے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ اور قدرتاً حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) کیا سیکولرازم قائم رہے گا، اگر کمیونزم آتا ہے تو وہ سیکولرازم کے منافی ہے۔ کمیونزم ایک نظریۂ حیات ہے اور لا مذہبیت بھی ایک مذہب ہے۔ کمیونزم میں کسی دوسرے مذہب یا کلچر کی گنجائش کہاں۔

(۲) کیا عدالتیں حکومت کے اثر سے آزاد رہیں گی جو اقلیتوں کی واحد امید گاہ ہیں۔ کمیونسٹ ملکوں میں عدالتیں حکومت کی ماتحت ہیں۔

(۳) کیا انفرادی آزادی باقی رہے گی۔ یعنی جمہوریت قائم رہے گی؟

ان سب کا جواب ہم لوگوں کا دل یہی دیتا ہے کہ "نہیں نہیں نہیں۔" کیوں کہ علی گڑھ مٹا دیا گیا۔ یہ کل پالیسی میں ایک عظیم تبدیلی ہے۔

محمد عدیل عباسی ایڈوکیٹ بستی

شائع شدہ قومی آواز مورخہ ۳۰ جون ۷۲ء